اورنگزیب یوسفزئی۔ اکتوبر ۲۰۱۶

تفسیر نویسی کی لایعنیت

The Absurdity of Tafseer Writing

صدیوں سے قرآنِ حکیم کی تفسیر لکھی جارہی ہے، مگر امت کا فکری، معاشی، سیاسی اور عمرانی زوال مسلسل بڑھتا جارہا ہے۔ ابتدا میں ہی خلافت علیٰ منہاجِ نبوت جس کا مرکز مدینہ منورہ تھا خلافت علیٰ منہاجِ ملوکیت میں بدل دی گئی اور اس کا مرکز دمشق قرار پایا۔ بعد ازاں سلطنتِ عباسیہ کا زوال واقع ہوا۔ سلطنتِ اندلس جس نے یورپ کے تاریک دور میں علم کے چراغ روشن کیے، نسلی تعصب کی بنیاد پر واقع ہونے والی ریشہ دوانیوں کی نذر ہو کر تباہ ہو گئی۔ اگلے مرحلے میں سلطنتِ مغلیہ برطانیہ کے ہاتھوں ختم کی گئی اور بالآخر تین براعظموں میں پھیلی خلافتِ عثمانیہ اپنی داخلی کمزوریوں کے باعث ٹکڑے ٹکڑے کر دی گئی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تفاسیر، علم الکلام، احادیث، فقہ اور تصوف کے مختلف مکاتب کی موجودگی اور اشاعت کے باوجود یہ زوال کیوں نہ رک سکا۔ یہاں ہم دیگر موضوعات سے قطع نظر صرف تفسیر پر نظر ڈالتے ہیں کیونکہ تفسیر کی تدوین میں ان دیگر تمام موضوعات سے بھرپور مدد لی جاتی ہے۔

تفسیر کی تاریخ بتاتی ہے کہ مفسرین نے جیسا کہ مولانا محمد اسلم جیراجپوری نے اپنی تاریخ تفسیر میں بتایا ہے، قرآن حکیم کی شرح کے لئے آیت وار تشریح کرنا، قرآن کے ایک حصے کی تشریح کے لئے اس کے دوسرے حصوں سے مدد لینا، قرآنی آیات کے لفظی مفہوم کے لیے ادبِ جاہلیہ کا مطالعہ کرنا، اس کے محاورات کی تدوین اور سورتوں اور آیات کے درمیان ربط تلاش کرنے کی کوشش جیسے اصولوں سے کام لیا اور اصولِ تفسیر کی سائنس کو مرتب کیا۔ احکام کی تفہیم کے لیے قیاس کے اصول کو اپنایا اور اس کی صحت مندی کے لیے استحسان، مصالح مرسلہ اور نظریہ ضرورت کے قوانین کو مدون کیا۔ مگر ان تمام کوششوں سے ملت کے زوال کو روکنے میں ہمیشہ ناکامی ہوتی رہی ہے اور آج بھی یہی صورتِ حال ہے۔

یہ تفاسیر نہ تو قرآن حکیم کے تصورِ کائنات کو اجاگر کر سکیں اور نہ ہی ملت کے لیے جاگیردارانہ معیشت، ملوکیت کے سیاسی نظام اور یونانی عقلیت کی جگہ قرآن کی عوامی معیشت، شورائی سیاست اور علم بالقلم یعنی تحقیق کے استقرائی منہاج کو ترویج دے سکیں جس کی اساس مشاہدہ و تجربہ پر مبنی ہوتی ہے اور جسے آج کی زبان میں سائنس کہا جاتا ہے۔

اسی طرح علم الکلام میں بحث و مباحثے کے لیے تجریدی اور مابعد الطبیعاتی موضوعات کو چن لیا گیا، جیسے وجودِ باری تعالی، اس کی وحدت و یکتائی، صفاتِ باری تعالی، حادث و قدیم، مخلوق و غیر مخلوق، حیات بعد از موت، اعمال انسانی کے نتائج، انسانی فطرت میں کسی دائمی نورانی عنصر کی موجودگی۔ مگر ان

کے عمرانی[social] اور نفسیاتی پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ تفاسیر ملت کی عمرانی زندگی میں کوئی قابلِ قدر تبدیلی نہ پیدا کر سکیں۔

ملت اس تفسیری مواد کے باوجود جاگیر داری معیشت، ملوکیت کی استحصالی سیاست، اور یونان کی غیر تجربی عقلیت کی دلدل میں پھنسی رہی۔ یہاں تک کہ یورپ کی بیداری نے فلسفہ، نفسیات، معیشت، سیاست اور منہاجِ تحقیق میں نئے افق، نئے زاویے اور نئے نقطہ ہائے نظر کو اجاگر کیا اور ملت اسلامیہ بحیثیت مجموعی اپنی فکری، معاشی اور عمرانی پسماندگی کے سبب مغربی اقوام کی غلامی میں آتی چلی گئی۔

مغربی ذہن نے تحقیق کے استقرائی منہاج کے ذریعے، جسے قرآن نے "علم بالقلم" کہہ کر پکارا ہے، کرہ ارض کے کونے کونے کو، سمندروں کی گہرائیوں اور فضا کی لامتناہیوں کو کھنگال ڈالا،،، اور آج پیداوار، مواصلات، حمل و نقل، ابلاغ اور اشاعتِ علم کے ذرائع میں بے پناہ وسعت نے دنیا کو ایک خاندان یا گلوبل ولیج[Global Village] میں تبدیل کر دیا ہے۔

مشینی صنعت کے پیدا کردہ سرمایہ داری نظامِ معیشت کے باعث جب محنت کشوں کی زندگی اجیرن ہو گئی اور ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی اقوام نو آبادیاتی نظام کے زیرِ اثر آ گئیں تو جرمن ذہن نے کارل مارکس کو پیدا کیا جس کی تحقیقات نے بتایا کہ مغرب کی ساری ترقی، اس کی دولت اور رفاہیت بالغہ کا سبب محنت کشوں کی محنت کی اجرت کا وہ حصہ ہے جسے ادا نہیں کیا گیا۔ اس ناادا شدہ[unpaid] اجرت کو "قدرِ زائد" کی اصطلاح دی گئی ہے۔ لہذا انسانی تاریخ کی ساری جنگیں، فسادات، ساری فتوحات، جنسی ابتذال، عورت کی تذلیل، غلامی، زرعی غلامی اور اجرتی غلامی کے اداروں کا قیام، سب ذرائع پیداوار پر چند افراد کی نجی ملکیت کا نتیجہ ہیں۔

مارکس کے اس عمرانی فلسفہ نے محنت کش کو ایسا نظریہ حیات و کائنات عطا کیا جس کی مدد سے اس نے تاریخ کے پہلے اشتراکی انقلاب کو کامیاب کر دیا اور نسل، قومیت، وطن، رنگ، زبان اور مذہب کی تفریق کے باوجود محنت کشوں میں وحدت کے امکان کو اجاگر کر کے وحدتِ انسانیت اور عالمگیر کلچر کی تشکیل کو معروضی حقیقت بننے کی امید پیدا کر دی۔ اس سوشلسٹ انقلاب نے مسلم اور غیر مسلم محکوم قوموں کو اپنی آزادی حاصل کرنے کا نہ صرف حوصلہ دیا بلکہ اشتراکی انقلاب نے ان کی نظریاتی اور مادی ذرائع سے مدد بھی کی۔

اس سارے عرصے میں مسلم اقوام کی مغرب سے اپنی سیاسی، معاشی اور ذہنی غلامی سے نجات حاصل کرنے اور نئے عہد کے نئے تقاضوں کے پیدا کردہ مائل کا اسلامی نقطۂ نظر سے حل تلاش کرنے میں یہ تفسیری مواد کوئی مدد نہ کر سکا۔ اپنی نجات اور ترقی کے لیے مسلم اقوام انقلابِ فرانس اور مغرب کی علمی ترقی، صنعتی سرمایہ داری نظام، بورژوائی جمہوری ادارہ اور مارکسزم سے وجدان حاصل کرتی رہی ہیں اور آج تک حاصل کر رہی ہیں۔ جب کہ ہمارے دینی ادارے تقلید جامد، رجعت پسند فکر اور شدید ماضی پرستی کی کہر میں بدستور کھوئے ہوئے ہیں۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ ضروری ہو گیا ہے کہ قرآن حکیم کی تفہیم کے لیے تمام قدیمی تفسیری مواد کو کالعدم قرار دیتے ہوئے، قرآن کو بحیثیت کل مطالعہ کر کے اس کے اپنی زبان میں خالص تراجم کے لیے نئے اصول وضع کیے جائیں اور نیا نقطۂِ نظر پیش کیا جائے۔ اس نئے اصولوں اور نئے نقطۂِ نظر کی مدد سے قرآن کے اُس بنیادی اور مرکزی نصب العین اور اُس مطلوب مقصدیت تک پہنچا جائے جس کے سبب عہدِ نبوت میں ایمان لانے والوں میں پہلے عرب اور بعد میں دوسرے معاشروں کو تبدیل کرنے کے لیے ایک بے مثال قوتِ عمل کا لاوا پھوٹ پڑا تھا۔

قرآنِ حکیم کو قدیم روایتی نہج پر سمجھنے کی بجائے جدید خطوط پر مطالعہ قرآن کی کوشش کا آغاز سرسید سے ہوا تھا۔ لیکن یہ رویہ اپنی افادیت کے باوجود اپنی ابتدا میں مغرب کے سامنے معذرت خواہانہ تھا۔ یہ سلسلہ حضرت علامہ اقبال پر آکر ختم ہوا۔ اقبال جہاں مغربی علوم اور مغربی تہذیب سے باخبر تھے وہاں اسلامی تاریخ، قرآنِ حکیم اور مشرقی تہذیب کا غائر مطالعہ بھی رکھتے تھے۔ اس طرح اقبال کی شخصیت مجمع البحرین کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ اسی سبب انہیں دونوں تہذیبوں کے تقابل کا موقع ملا جس سے وہ اس حقیقت سے مطلع ہوئے کہ قرآنی حکمت ہی عہدِ حاضر میں انسان کی راہنمائی کا فریضہ سرانجام دے سکتی ہے۔ ڈاکٹر نکلسن کو اپنی اسلام پسندی کی وجہ بتاتے ہوئے انہوں نے کہا ہے کہ "میں ایک ایسے عمرانی نظام کی تلاش میں تھا جس کی اساس رنگ، نسل، قومیت اور مذہب وغیرہ کی بجائے وحدتِ انسانی پر ہو۔ ایسا عمرانی نظام مجھے اسلام میں ملا ہے"۔

اس آگہی نے مغرب کے سامنے معذرت خواہانہ رویہ کا خاتمہ کر دیا اور قرآنی حکمت کی روشنی نے مغربی تہذیب پر بڑی جارحانہ تنقید کرنے کی ان میں جرات اور حوصلہ پیدا کر دیا۔ اقبال کے بعد جن مسلم سکالرز کا ذکر کیا جارہا ہے ان کا رویہ بھی معذرت خواہانہ کی بجائے مغربی تہذیب کے صحت مند اور تعمیری پہلوؤں کو اخذ کرنے کے ساتھ اس کے غیر انسانی اور مخرب الاخلاق رویوں کو مسترد کرنے کی جرات کا حامل ہے۔

قرآنِ حکیم کو نئے نقطۂِ نظر سے مطالعہ کرنے والے اصحابِ دانش و فکر کے مکاتبِ فکر کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم وہ ہے جو ذرائع پیداوار کو انفرادی اور نجی ملکیت سے نکال کر اجتماعی ملکیت میں لانے کی ضرورت نہیں سمجھتے، بلکہ مالدار طبقے کو ترغیب و تربیت اور حکومتی ضوابط کے ذریعے بڑے اکتنازِ دولت [الربا] سے روک کر ایک فلاحی مملکت کا قیام چاہتے ہیں، جو ہر فرد کو اس کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی مکلف ہو۔

دوسری قسم ان اصحابِ فکر پر مشتمل ہے جو ذرائع پیداوار پر اجتماعی ملکیت کو ملتِ اسلامیہ اور ساری انسانیت کی فلاح کے لیے لازمی سمجھتے ہیں تاکہ ایک عالمگیر روحانی اشتراکی معاشرے کا قیام عمل میں لایا جاسکے۔ دانشوروں کا یہ طبقہ مانتا ہے کہ ایسے ہی معاشرے کو اقبال نے روحانی جمہوریت یا مرغدینی سوسائٹی یا محکماتِ عالمِ قرآنی کہا ہے۔ مارکس نے لاطبقاتی معاشرہ کہا ہے۔ قرآن نے جنتی معاشرہ اور حضرت مسیح نے خدا کی بادشاہت سے موسوم کیا ہے۔ ان مسلم اصحابِ فکر و دانش میں مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، پروفیسر اجمل خان، ڈاکٹر فضل الرحمان، ڈاکٹر رشید جالندھری، ڈاکٹر منظور احمد، ڈاکٹر یوسف گورایہ، ڈاکٹر علی شریعتی [ایران]، ڈاکٹر رفیع الدین، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، اور جناب غلام احمد پرویز شامل ہیں۔

ملی جدوجہد کی تاریخ کا ترتیب وار مطالعہ، سیرتِ طیبہ کے روایت سازی سے پاک اور مستند مواد پر گہری نظر، اور طبقاتی نقطۂ نظر سے قرآن کا مطالعہ اور ان سب کی روشنی میں ایک بالضبط ترجمے کی اجتماعی کوشش، قرآن کی بنیادی تعلیمات اور نصب العینوں تک پہنچنے کا اب ایک واحد درست ذریعہ ہے۔ اور یہی ذریعہ عہدِ حاضر میں تفہیمِ قرآن کے لیے ایک ضروری منہاج کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ دوسرے نقطہ ہائے نظر سے آج تک قرآن سمجھا نہیں جاسکا۔ اور اسی سبب سے کوئی انقلابی قدم نہیں اُٹھایا جاسکا۔ ہمارے سامنے موجود محض ظواہر پرستی، گناہ و ثواب کا ایک طویل اور مبہم فقہی ضابطہ، اور مطلب پرستانہ انداز میں تعبیر شدہ قرآنی سزاوں کی اساس پر نہ کوئی تبدیلی آسکتی ہے اور نہ ہی آئندہ آنے کی امید ہے۔ ہر کوشش آج تک ناکام رہی ہے۔ ہمارا ہمالیہ کی چوٹی سے بھی بلند تفسیری مواد تو اس سلسلے میں بالکل لاچار ہے کیونکہ تفسیر نویسی ملوکیت کی استحصالی سیاست کی ایک چال تھی جو انتہائی مذموم خواہش پرستانہ مقاصد رکھتی تھی۔ اور جس کی بعد ازاں، ایک خیرِ کبیر کے مغالطے میں، ہر دور میں اور ہر نسل[generation] کے ہاتھوں، آج تک جلد پر جلد لکھی جاتی رہی ہے۔ جو قوم میں کوئی قوت عمل پھونکنے کی بجائے بے کار پڑی ہے۔

ملی جدوجہد کی تاریخ کے مطابق قرآن کے مطالعے کی اہمیت یہ ہے کہ قرآن کے مخاطب مکہ کے غلام ساز مالدار سردار تھے جن کی سرپرستی میں ایک انتہائی استحصالی، ظالمانہ اور طبقاتی معاشرہ قائم تھا۔ اگر اس اولین جدوجہد کے تناظر کو پیشِ نظر رکھا جاتا تو ملتِ اسلامیہ میں نہ تو غلامی کا ادارہ دوام حاصل کرتا، نہ ہی جاگیرداری اور ملوکیت کے معاشی اور سیاسی نظام قائم ہوتے، اور نہ ہی یونان کی غیر تجربی اور قیاسی عقلیت کو اپنانے کی ضرورت پڑتی۔ کیونکہ پہلی وحی میں ہی "علم بالقلم"، یعنی وہ علم جو تجربہ و مشاہدہ پر مبنی ہے، کی نوید آچکی تھی۔ بلکہ وحی الٰہی، جس کا بنیادی مقصد "کُل انسانیت کی منفعت" ہے، کی روشنی میں معاشی مساوات، عوامی جمہوریت اور استقرائی عقلیت کا قیام عمل میں آچکا ہوتا۔ اسی سبب سے علامہ اقبال نے کہا تھا کہ ملوکیت کے باعث اسلام کا معاشی نظام عمل میں نہیں آسکا، اور اس طرح پسماندہ طبقات اسلام کی برکات سے محروم رہے۔ اور انہیں اپنی بیداری اور کامیابی کے لیے کئی صدیوں تک کارل مارکس کی عمرانی تحقیقات کا انتظار کرنا پڑا۔

اسلام کیونکہ آخری مذہب تھا اس لیے قرآن کی معاشی، سیاسی، عائلی، کائناتی اور ثقافتی ہدایات تمام اقوامِ عالم کے لیے تھیں۔ عرب کا خطہ تو محض ایک تجربہ گاہ کی یا ایک بہترین عملی ماڈل کی حیثیت رکھتا تھا۔ مگر بنو امیہ نے مدینہ کی شورائی خلافت کی جگہ موروثی مطلق العنان ملوکیت قائم کرکے انسانیت کو اسلام کی برکات سے محروم کر دیا۔ انہوں نے یہ ظلم بھی کیا کہ مذہبی پیشوائیت کو اپنے ہم قوموں میں اور اپنے مخصوص موروثی وطن میں قائم رکھنے کے لیے عرب کے خطے کو ہی آنے والے تمام زمانوں کے لیے اسلام کا مرکز اور قبلہ و کعبہ قرار دے دیا اور اس کے لیے حج کا ادارہ دوبارہ منظم بنیادوں پر تشکیل دے دیا جو انہی کے بت پرستی کے ایام کی ایک متروکہ بدعت تھی۔

بہر حال مذکورہ اصحابِ فکر و دانش کی محنتِ شاقہ کے باعث قرآن حکیم کی شرح و توضیح سے اس فکری انتشار کو ختم کرنے میں بڑی مدد ملی ہے جو تفسیر نویسی کے جرم کے ذریعے امت کے اذہان میں رائج کروا دیا گیا ہے۔ جس سے دنیا کو بدلنے کے لیے نہ تو نصب العین متعین ہو سکا اور نہ ہی اس نصب

العین کو حاصل کرنے کے لیے انقلابی جدوجہد ہو سکی۔ بلکہ اس کے بر عکس امت مفسرین وفقہا کے باہمی اختلافات کے سبب متحارب فرقوں میں بٹ گئی اور انسانی معاشرہ کو تبدیل کرنے کی بجائے یہ فرقے آپس میں الجھنے لگے۔

اسلامی تحریک کی تاریخ وار جدوجہد کے مطابق مطالعے نے اسلام کو مذہب کی بجائے ایک انقلابی تحریک کی حیثیت دے دی ہے، جس کا مقصد انسانی معاشرے سے اُس مراعات یافتہ طبقے کو ختم کر دینا ہے جو نہ صرف اُس عہد کے عرب معاشرے میں بلکہ عہدِ زراعت کے آغاز سے انسانی معاشرہ میں ظلم وفساد اور اخلاقی تباہی کا باعث بنا رہا ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ کارل مارکس نے اپنے دوست فریڈرک اینگلز کے ساتھ خط وکتابت میں اسلام کو محمڈن ریلیجن [Mohammadan Religion] کی بجائے محمڈن ریوولیوشن [Mohammadan Revolution] کا نام دیا ہے۔

قرآن نے سورۃ "والعصر" میں یہ حقیقت بیان کی ہے کہ انسانی تاریخ میں انسانوں کی اکثریت جو عام طور پر غلاموں، زرعی غلاموں اور اجرتی غلاموں پر مشتمل رہی ہے اور آج بھی ہے، ہمیشہ تباہی وخسران میں مبتلا رہی ہے۔ اس تباہی وخسران کی بنیادی وجہ معاشرہِ انسانی کا معاشی طبقات میں منقسم ہو جانا ہے۔ قصہِ آدم میں آدم کا حیاتِ جنت سے حیاتِ ارضی میں ھبوط کا مفہوم طبقاتی تقسیم ہے کیونکہ قرآن نے کہا ہے کہ ھبوط کا سبب یہ ہے کہ "تم اب باہم ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے ہو" ۔ بعضکم لبعض عدو"۔ یہ دشمنی طبقاتی کشمکش اور تنازع کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ حکمران اور دولت مند طبقے اپنی سلطنت کی حدود کی توسیع، مال ودولت اور غلاموں کی کثیر تعداد کے حصول کے لیے جنگ وجدل، لُوٹ مار کرتے رہے، اور رزق اور تہذیب وعلم کی برکتوں سے محروم کمزور وپسماندہ طبقوں پر ظلم وجبر کرتے رہے ہیں۔ یہ جنگیں اور ظلم وستم کبھی مذہب، کبھی نسل وقومیت کے تفاخر اور کبھی دشمن کو نیچا دکھانے کے نام پر کبھی کھلے طور پر اور کبھی پس پردہ جاری رکھے جاتے رہے ہیں۔ اس طبقاتی تقسیم کے باعث انسان نے انسان پر اور قوموں نے قوموں پر اس قدر ظلم وستم، جنگ وجدل اور خونریزی کی ہے کہ ساری تاریخ انہی اعمال سے لہولہان ہے۔

تاریخ کی تمام تہذیبیں جیسے آشوریہ، بابلونیہ، کالڈیہ، سمیریہ، ایرانی، مصری اور رومی تہذیبیں باہمی قتل وغارت گری، جنسی ہوس، استحصالِ محنت اور ہوسِ زراندوزی کے باعث برباد ہو گئیں۔ ہمارے عہد میں مضہ کارخانوں میں تیار شدہ اشیاء کو بیچنے کے لیے مغربی اقوام نے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی غیر ترقی یافتہ اور کمزور اقوام پر نو آبادیاتی نظام مسلط کر کے انہیں غلام بنالیا۔ ان اقوام کے خام مال کے ذخائر کو بے دردی سے لوٹا اور ان کے افراد کی محنت کا انتہائی سستے داموں خرید کر استحصال کیا تاکہ وہ اپنے کارخانوں کی تیار کردہ اشیاء کے بیچنے کے لیے ان خطوں کو منڈی میں تبدیل کر سکیں اور اس غرض کی تکمیل کے لیے تیسری دنیا کی اقوام کی نسلوں کو مغربی تہذیب میں رنگنے کی کوشش کی۔

آزاد منڈی کی معیشت کے باعث دو خون ریز جنگیں ہو چکی ہیں اور تیسری تباہ کن جنگ کے لیے تیاری کی جارہی ہے۔ منڈیوں پر قبضہ کے لیے یورپی اقوام میں صف بندی آج بھی جاری ہے۔ اس ساری داستان کو صارفیت Consumerism کہتے ہیں۔ دولتمند طبقات کی ہوسِ زر کو پورا کرنے کے لیے دنیا کے مختلف خطوں میں علاقائی متحارب گروہ پیدا کیے جاتے ہیں اور وہاں کی حکومتوں کے مابین مختلف اسباب کی بنا پر باقاعدہ جنگیں کروائی جاتی

ہیں تاکہ اسلحہ سازی کے بڑے کارخانوں کی مصنوعات کے لیے صارف پیدا ہوتے رہیں۔ محاذ آرائیاں خود پیدا کروائی جاتی ہیں تاکہ زمانہ امن میں بھی دونوں مخالف ممالک اسلحے کے انبار مغربی طاقتوں سے خرید کر جمع کرتے رہیں۔

لہذا اس طبقاتی پیراڈائم کو نظر انداز کرنے سے ہمارا تفسیری ادب اسلام کے معاشی اور سیاسی نظام کو کوئی متعین شکل نہ دے سکا۔ نہ ہی عورت کے معاشرتی مرتبے اور عورت مرد کے تعلقات کو واضح کر سکا۔ نہ ہی یہ بتا سکا کہ کائنات، معاشرہ اور ذہنِ انسانی میں حرکت و تغیر کا عمل جاری ہے یا نہیں۔ اور اگر جاری ہے تو حرکت کی نوعیت دولابی Cyclical ہے یا ترقی پذیر Linear ہے۔ اور نہ ہی یہ بتا سکا کہ معاشرتی حرکت کسی نصب العینی معاشرہ کے قیام کی طرف ارتقاپذیر ہے یا نہیں۔ اس غفلت سے ملوکیت اور غلامی کے ادارے مضبوط ہو گئے اور مسلم تاریخ کے ہر دور میں عوام علم سے بے بہرہ، مفلس اور انتہائی پسماندہ حالت میں رہتے رہے ہیں۔

اس طبقاتی پیراڈائم کے نقطہ نظر سے کوئی ایک بھی تفسیر موجود نہیں ہے۔ وہ مسلم علماء اور سکالر جو طبقاتی نقطہ نظر کی اہمیت کو سمجھتے ہیں انہوں نے بھی اس کی روشنی میں قرآن حکیم کی کوئی مکمل تفسیر نہیں لکھی۔ اس سلسلہ میں جناب غلام احمد پرویز کی کوشش قابلِ قدر ہے۔ مگر ایک تو یہ کوشش محض معاشی مسئلہ تک محدود ہے، دوسرے مسلم معاشرے کی طبقاتی نہج کو تبدیل کرنے کے لیے یہ کوئی سیاسی تحریک پیدا نہیں کر سکی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلم فکر اور معاشرتی تنظیم دونوں میں جمود اور رجعت پسند رجحانات نے جڑ پکڑ رکھی ہے۔ اور مسلم امہ زندگی کی دوڑ میں انتہائی پست درجہ پر مقیم ہے۔ مارکس کے فلسفہِ حیات پر تو ایک عظیم الارن مملکت قائم ہو کر ٹوٹ چکی ہے، مگر دنیا کے دوسرے حصوں میں بعض جگہ اس طبقاتی فلسفے پر ریاستیں قائم ہیں جن میں چین، شمالی کوریا، ویت نام، کیوبا اور نکاراگوا وغیرہ موجود ہیں۔ اور جہاں ریاستیں نہیں وہاں کمیونسٹ پارٹیوں کی تنظیمیں موجود ہیں۔ مگر مذاہبِ عالم میں عموماً اور اسلام میں خصوصاً قرآن یا کتبِ مقدسہ کی اساس پر ایسی کوئی نہ تو تنیمہ موجود ہے اور نہ ہی کوئی نظریہ حیات موجود ہے۔ تمام مسلم ممالک میں یا تو ملوکیت قائم ہے یا پھر وہ سرمایہ دارانہ جمہوریت کے زیرِ اثر ہیں۔

اس صورتِ حال کو صرف اور صرف طبقاتی پیراڈائم کی روشنی میں اسلام اور قرآن کا مطالعہ اور اس مطالعے سے اخذ ہونے والے نتائج کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک سیاسی جماعت اور سیاسی تحریک کا قیام ہی بدل سکتا ہے۔ اور ایسے ادارے کے قیام کے لیے ابن الوقت اور محنت کا استاصکل کرنے والے دھوکے باز سرمایہ داروں کی بجائے خلوصِ نیت اور مشنری جذبے رکھنے والے دانشوروں اور صاحبِ حیثیت افراد کی ضرورت ہے۔

تعجب ہے کہ قرآن حکیم کا سرسری مطالعہ بھی معاشی طبقات کی نشان دہی کر دیتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ سورۃ البقرۃ کے عنوان میں "البقرۃ" اسی معاشرتی تقسیم [Split, divide, discord or dissention that severs society, corrupts religion and separates men]

کو کہا گیا ہے اور اس قرآنی حقیقت کو چھپانے کے لیے اس کا ایک انتہائی عامیانہ اور بازاری معنی "گائے۔ "Cow مروج کر دیا گیا۔ کسی بھی مسلم دانشور یا نابغے نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ اللہ تعالیٰ کے نہایت بلند و بالا اور شان و شوکت رکھنے والے کلام میں ایک طویل اور اہم ترین

باب کا "گائے۔ Cow" جیسے ایک حیوان کے عنوان کے ساتھ آنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟؟؟ اور "البقرۃ" کی اصطلاح کا کوئی دیگر علمی و ادبی معنی بھی موجود ہونا ممکن ہے یا نہیں؟

اسی کی مانند سورۃ النساء میں لفظ "النساء" انسانی حقوق کے لحاظ سے فراموش شدہ کمزور طبقات، یعنی غریب محروم عوام کے لیے استعمال کیا گیا،، کیونکہ قرآنِ حکیم کا یہ باب اسی کمزور طبقے کے حقوق کی نشاندہی اور اسی کے تحفظ اور بہتری کے احکامات واضح کرنے کے لیے مخصوص کیا گیا۔ لیکن جسے تبدیل و تحویل کا شکار کر کے "عورت" کے غیر مستند معنی میں راسخ کر دیا گیا۔ کہا گیا کہ عورت کے لیے المراۃ کا لفظ تو موجود و مستند ہے لیکن اس لفظ کی جمع "النساء" ہے؟۔۔۔۔ جب کہ قرآن میں عورت کو تو النساء کی درجہ بندی میں صرف اس بناء پر شامل کر لیا گیا ہے کہ اسے بھی ظلم و جبر کے استعمال سے بدترین استحصال کا شکار بناتے ہوئے حقوق سے محروم کمزور طبقات میں شامل کیا جاتا رہا ہے۔

آج اگر ایسی قرآنی اصطلاحات کا درست ادبی اور علمی ترجمہ سامنے لایا جاتا ہے جس کی شہرہ آفاق مستند ترین لغات پشت پناہی کرتی ہیں، اور جو قرآن کے حقیقی طبقاتی تناظر کی مکمل نشاندہی کرتا ہے اور ساتھ ساتھ اس الہامی وثیقے کے اعلیٰ ترین ادبی اسلوب کی تصدیق کرتا ہے، تو ہمارے پڑھے لکھے طبقے میں سے ۹۰ فیصد لوگ اس کا بطلان کرنے کے لیے سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح گویا جدید علمی انکشافات سے انکار اور جہالت، قدامت پرستی اور ذہنی فرسودگی پر اصرار کرتے ہیں۔ اگر ہمارا روایتی اور جدید عقلی مفسر قرآن کی اس معاشی اور معاشرتی حقیقت پر مطلع ہو جاتا، یا اس پر جان بوجھ کر دبیز پردے نہ ڈال دیتا، تو کارل مارکس سے کہیں پہلے، طبقاتی پیراڈائم کے انطباق سے، انسانی مسائل جیسے عمرانی و نفسیاتی علوم سے آگہی، اور قرآن اور دوسری کتبِ مقدسہ کی صحیح تفہیم عمل میں آ گئی ہوتی اور انسانی معاشرہ طبقات کے ارضی دائرہ سے نکل کر لاطبقاتی جنتی معاشرہ کی تکمیل کے قریب آ جاتا۔ مگر مذاہبِ عالم کے دانشوروں اور مذہبی پیشواوں نے اپنے مفاد کے مدِ نظر اس معاشی اور عمرانی حقیقتِ ثابتہ کو عوام کی نظروں سے اوجھل رکھا اور مترفین و مستکبرین یعنی حکمرانوں اور مالداروں کے تعاون سے اپنی حیاتِ دنیاوی میں آرام و آسائش حاصل کرتے رہے۔ اور آج بھی کر رہے ہیں۔

یہ واضح کر دیا جائے کہ ہمارے جن نہایت قیمتی دانشورانِ ملت کی تحریروں سے متاثر [Inspire] ہو کر تحریرِ ھذا سپردِ قلم کی جا رہی ہے ان میں اکثر اس نظریے کے حامی نظر آتے ہیں کہ قرآن حکیم کی ترتیبِ نزولی کو فراموش کر دینے یا اس میں ایک بڑی تبدیلی کے دخل سے مطالعہ قرآن کی درست ترتیب کو نقصان پہنچا ہے۔ اور یہ کہ ترتیب نزولی کے مطابق مطالعے کے بغیر قرآن کے مطلوب و مقصود اور نصب العینوں تک پہنچا ہی نہیں جا سکتا۔ اس سلسلے میں مولانا عبد الکلام آزاد کے پرائیویٹ سکرٹری جناب پروفیسر محمد اجمل خان کی مرتب کی گئی ترتیب پر زور دیا جاتا ہے جو جنابِ پروفیسر صاحب نے امام عبید اللہ سندھی کی ترغیب پر نہایت محنتِ شاقہ کے ساتھ مدون کی تھی۔ یہ بھی امید کی جاتی ہے کہ پروفیسر محمد اجمل خان کی

ترتیبِ نزولی کے بعد، جو اپنی حیثیت میں بڑی سائنٹفک اساس اور جامعیت کی حامل ہے، ڈاکٹر علی شریعتی کے افکار کی روشنی میں قرآن کی ایسی تفسیر لکھی جاسکے گی جو مسلم معاشرے کو تبدیل کرنے کے لیے مسلم ذہن میں انقلابی جذبات پیدا کر سکے گی۔

واضح ہو کہ ڈاکٹر علی شریعتی نے اس موضوع پر بڑا اہم کام کیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر موصوف نے پیرس یونیورسٹی سے تاریخِ مذاہبِ عالم اور سوشیالوجی [عمرانیات] میں الگ الگ پی۔ایچ۔ڈی کیا۔ جس کے نتیجے میں مذہب کی تاریخ میں پہلی دفعہ مذہب کی تاریخ اور اس کی اصطلاحات کے عمرانی پہلو کو نمایاں ہونے میں مدد ملی۔

ہمارے فاضل دانشوران کا موقف یہ تھا کہ اگرچہ مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا عبدالرحیم پوپلزئی، صدر مجلسِ احرار چودھری افضل حق اور مولانا حسرت موہانی جیسے علماء اور دانشوروں نے اس سلسلہ میں قابل قدر کام کیا ہے مگر یہ کام نامکمل ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان بزرگوں کے سامنے قرآن حکیم کی ترتیبِ نزولی نہیں تھی۔ قرآنِ حکیم کو اس کی ترتیبِ نزولی سے الگ کر دینے کے باعث قرآن رسول اللہ کے انقلابی عمل سے بھی الگ ہو گیا اور انقلابی عمل سے علیحدہ ہونے کے سبب وہ اپنے انقلابی مقاصد بھی پورے نہ کر سکا۔ جس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ میں انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس جیسا کوئی انقلاب وجود پذیر نہیں ہو سکا جو ملت کے فکر و عمل اور اس کے اداروں کو ملوکیت، جاگیرداری اور ملائیت کے گرداب سے نکال کر نئی زندگی اور نئے فکری افق سے روشناس کر سکتا۔

آگے بڑھنے سے قبل ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ترتیب نزولی کا سوال سیر حاصل طریقے سے حل کر لیا جائے۔ ہمارے دانشورانِ ملت کی نہایت مثبت سوچ اور اس کے تحقیقی نتائج اور ان سے ابھرتی ہوئی نئی علمی روشنی کو پورا کریڈٹ دیا جاتا ہے۔ البتہ مذکورہ نتائج کے ضمن میں جدید ترین جدلیاتی عقلیت کے معیار پر کام کرتے ہوئے یہاں دو تین بہت خاص نقاط ابھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں جو کچھ اس طرح ہیں۔

اول یہ کہ اُن مو قر شخصیات کی سوچ میں موجودہ ترتیبِ قرآن کو رسولِ کریم کی مقرر کردہ ترتیب تسلیم نہیں کیا گیا، اور اسی لیے یہ نتیجہ نکال لیا گیا کہ اسے حضرت عثمان کے عہد میں جمع و ترتیب دیے جانے کے باعث یہ بڑی غلطی سرزد ہو گئی کہ اس کاروائی میں ترتیبِ نزولی کا بالکل لحاظ نہیں رکھا گیا۔ اور اس بڑی سہو کے باعث تفاسیر غلط رُخ اختیار کر گئیں اور قرآن فہمی کی مہم اس کتاب کے مقاصد و نصب العین کو پیشِ نظر نہ رکھ پائی۔۔۔۔۔۔ دوم یہ کہ اگر موجودہ ترتیب کو رسولِ کریم ہی کی متعین کردہ مان لیا جائے تو پھر ہمارے ان فاضل دانشوروں کے موقف کے مطابق یہ لازم آجاتا ہے کہ خدانخواستہ حضورِ رسالتمآب نے ایک بڑی غلطی کا ارتکاب فرمایا۔ سورتوں اور رکعات کو ترتیب دیتے وقت ان کی ترتیبِ نزولی کا لحاظ نہ رکھا۔ جس کے باعث بعد ازاں آنے والی تفاسیر کے ذریعے قرآن فہمی کا عمل ادھورا رہ گیا یا اپنی درست لائن سے انحراف کر گیا۔ نعوذ باللہ۔۔۔۔۔ اور سوئم یہ مفروضہ بھی قائم کر لیا گیا کہ اگر قرآن کا مطالعہ ترتیبِ نزولی کے مطابق کیا جاتا تو اس کی تفاسیر دین کی اصل مقصدیت اور نصب العینوں کو سامنے لا

چکی ہوتیں اور اسلامی دنیا میں انقلاب آکر طبقاتی تقسیم کا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔ کیا ایسا ممکن تھا؟؟؟۔۔۔۔۔ ہم ایک قرینِ عقل نتیجے تک پہنچنے کے لیے باری باری تینوں ممکنہ صورتِ احوال کا مطالعہ کریں گے۔

پہلا موقف: موجودہ ترتیبِ قرآن رسولِ کریم کی مقرر کردہ نہیں ہے۔ اس لیے یہ ترتیبِ نزولی سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اس لیے غلط ہے؟؟؟

اب اس بڑے قضیے کو درست ماننے کے لیے ہمیں عہدِ عثمانی میں جمع القرآن کی بڑی کاروائی کو اور اس کے ضمن میں ان تمام احادیث و روایات کو درست ماننا پڑے گا جن کے بیانات کے ذریعے سے قرآن کے اجزاء کا ہڈیوں، پتھروں، کھجور کے پتوں وغیرہ پر لکھا جانا اور ایک انتہائی بکھری ہوئی حالت میں حفاظ کی یادداشت میں پایا جانا ثابت کیا جاتا ہے۔ یہ اس لیے کہ اس سلسلے میں ہماری تواریخ میں جو کچھ تحریر کیا گیا ہے وہ واقعاتی ہونے کی بجائے انہی احادیث و روایات سے اخذ کیا گیا ہے۔ اور تاریخ میں تحقیق ہمیں لازمی طور پر بیانیوں کے ماخذات [Sources] کی جانچ کی جانب لے جاتی ہے۔ تحقیق سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ وہ تمام تاریخی واقعات جن کا ماخذ روایات ہیں نہایت مشکوک کیفیت رکھتے ہیں۔ یعنی ہمیں یہ مفروضہ مان لینے کی جانب لے جایا جا رہا ہے کہ حضور رسالتمآب نے قرآن جیسے ہمیشہ باقی رہنے والے الہامی وثیقے کی تحفیظ و تنظیم و ترتیب کے لیے اپنی زندگی میں کوئی تحریری انتظام یا اہتمام نہیں کیا تھا۔ اور حفاظ کی یادداشت سے اور ادھر اُدھر کی جزوی تحریروں سے، ایک انتہائی مشکوک اور مبہم طریقے سے، قرآن کی بکھری ہوئی سورتوں کو اکٹھا کرنا پڑا؟؟؟؟۔۔۔۔ اب اگر بادنی تعمق غور کیا جائے تو عقلِ سلیم کی رُو سے ایسا ممکن ہی نہ تھا کہ رسالتمآب اپنے اس اہم ترین فریضے کی ادائیگی میں ذرا بھی تساہل برتتے۔ نیز اگر ہم قرآن کی تحریر و ترتیب کو عہدِ عثمانی کا کارنامہ مان لیں تو اس سلسلے کی ماخذ جس قسم کی غیر منطقی و غیر مستند کہانیاں ہمیں ورثے میں ملی ہیں اُن کے باعث قرآن کی وثاقت اور درستگی کا معیار بھی شدید ابہام و شکوک کی نذر ہو جاتا ہے۔ نیز سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے علاوہ بھی ہمیں قرآن کی ایسی بہت سی آیات کا انکار کرنا پڑتا ہے جہاں قرآن کو اس کے نزول کے اولین مرحلے سے ہی کتاب کہا گیا ہے یعنی ایک نظم کے ساتھ لکھی ہوئی تحریر۔ ظاہر ہے کہ ہم قرآن کی سند کے خلاف نہیں جاسکتے، اس لیے ہمارے موقر دانشوروں کا یہ موقف بوجوہ تسلیم کرنے کے لائق نہیں ہے۔

دوسرا موقف: دوسرا مفروضہ کہ قرآن رسولِ کریم ہی کے ہاتھوں مرتب کردہ تو ہے، لیکن رسولِ کریم نے ترتیبِ نزولی کے مطابق ترتیب قائم نہ رکھ کر اس کے مقاصد اور نصب العینوں کو امت کے لیے ناقابلِ فہم بنا دیا ہے [نعوذ باللہ]؟؟؟

اگر اس نہج پر سوچا جائے تو اس موقف سے تو سیدھا سیدھا توہینِ رسالت کا ارتکاب ہوتا ہے اور رسولِ کریم کے ایک بڑے اور سوچے سمجھے عمل کو ایک غلطی کا مرتکب قرار دیا جاتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ قرآن ہمیشہ سے ہمارے پاس رسولی ترتیب کے مطابق ہی موجود ہے اور اس ترتیب کو اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہونے میں بھی کسی شک و شبہ کا امکان موجود نہیں ہے۔ نیز رسولِ کریم نے اپنی الہامی دانش و حکمت سے قرآن کو اُسی

نظم میں ترتیب دیا ہے جو حق تعالی کا منشاو مقصود تھا۔ اور جو اس کا ممکنہ طور پر بہترین نظمِ ترتیب [best order] ہو سکتا تھا۔ ارشادِ باری تعالی کے مطابق قرآن جوں جوں نازل ہو تا گیا ایک نہایت معزز اور محترم خوش نویسوں کی جماعت اسے تحریر کے احاطہ میں لاتی گئی۔ یہ وحی کی تکمیل کی ابتدا سے ہی اتنا مکمل وثیقہ تھا کہ عہدِ عثمانی سے برسوں قبل عہدِ عمر بن خطاب میں اس کے لاکھوں نسخے کتابت کروا کر مملکتِ اسلامیہ کے طول و عرض میں پھیلا دیے گئے تھے۔ نیز قرآن کا جامع اور محافظ قرآن کے فرمان کے مطابق خود باری تعالی کی ذات ہے۔ بھلا وہ ذاتِ پاک کیسے اس دائمی قائم رہنے والے انسانی ہدایت پر مبنی الہامی وثیقے کو بد نظمی کا شکار ہونے کی اجازت دے سکتا تھا؟ اور اس کی تجمیع و ترتیب کو ساری دنیا کے شکوک و شبہات کا ہدف بننے کے لیے عہدِ عثمانی تک کیسے موخر کر سکتا تھا؟ اگر بالفرض جمع قرآن اور ترتیبِ سُور اور رکوعات عہدِ عثمانی ہی میں انجام پائی تھی تو وہ کون سے مکمل قرآنی نسخہ جات تھے تو عہدِ فاروقی ہی میں مملکت کے طول و عرض میں لاکھوں کی تعداد میں پھیلا دیے گئے تھے؟

تیسرا موقف: تیسرا مفروضہ کہ اگر قرآن کا مطالعہ ترتیبِ نزولی کے مطابق کیا جاتا تو اس کی تفاسیر دین کی اصل مقصدیت اور نصب العینوں کو سامنے لا چکی ہوتیں اور اسلامی دنیا میں انقلاب آکر طبقاتی تقسیم کا خاتمہ ہو چکا ہوتا؟؟؟

یہ موقف بھی تاریخ میں تازہ ترین تحقیق اور جدید انکشافات سے لاعلمی کا نتیجہ ہے اور ایک بڑی خوش فہمی پر مبنی ہے۔ تفسیر نویسی کا فن اپنی اصل میں ہی خلافِ ارشاداتِ قرآنی ہے اس لیے ایسا عمل دین کی اصل حقیقت کو سامنے نہیں لا سکتا۔ یہ علم قرآن کی اُن خاص ہدایات کی نافرمانی میں متعارف کروایا گیا تھا جہاں یہ فیصلہ کن انداز میں کہ دیا گیا تھا کہ یہ کتاب خود ہی احسن تفسیر ہے۔ اور مکمل طور پر خود تشریحی اور خود مکتفی ہے۔ اور اس فرمانِ الٰہی کے علی الرغم، یا اس کی نافرمانی میں، تفسیر نویسی کرنے کا واحد مقصد ارشاداتِ ربانی میں انسانی خیالات و تصورات کی آمیزش کر کے دینِ حق کی پاک و منزہ صورت کو مسخ کرتے ہوئے اسے ایک غیر مربوط، غیر عقلی، دیومالائی کلام کی شکل میں پیش کرنا تھا۔

اس مہم کی پشت پر خلافتِ دمشق کار فرما تھی جو اپنی نوع میں ایک خالص غاصب اور خائن ڈکٹیٹر شپ تھی۔ اور کیونکہ اسلام کے تمام سیاسی اور معاشرتی اصولوں اور قوانین کو غارت کرتی ہوئی اقتدار میں داخل ہوئی تھی اس لیے خود پر لگنے والے الزامات اور اپنے ناجائز قبضے کے عدم جواز سے بچنے کے لیے اسلام کی اصل روح کو بگاڑ دینا اس کا اولین ہدف تھا۔ یہ ہدف دو ذرائع سے پورا کیا گیا۔ کیونکہ عہدِ فاروقی سے سلطنت کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے لاتعداد قرآنی نسخوں اور قرآنی تعلیم کے مراکز کو ختم نہیں کروایا جا سکتا تھا اس لیے انہیں علٰی حالہ چھوڑنا پڑا اور یہ متبادل طریقہ اختیار کیا گیا کہ ایک طرف قرآن کی تفاسیر لکھوا کر ان کو علاقائی گورنروں کے ذریعے تلوار کے زور پر منوایا گیا [دیکھیے ڈان گبسن "قرآنک جیوگرافی" ۔ صفحہ ۲۴۸۔ سنہ ۷۱۰ کے سامنے لکھے مندرجات] اور قرآن کے مقصود و مطلوب کو نظروں سے غائب کر دیا گیا۔ دوسری طرف قرآن کے متوازی ایک اور ماخذِ ہدایت احادیثِ نبوی کے نام پر ایجاد کیا گیا جس کے ذریعے دین میں دنیا جہان کی خرافات ارشاداتِ رسول کے نام پر بھر دی گئیں جن کی مدد سے ایک عیاش استحصالی اور غاصب حکمران جماعت کو مسلمانوں پر حکمرانی کی سندِ جواز عطا کر دی گئی۔ دین میں ثنویت [Dualism] کا ناپسندیدہ

عنصر داخل کر دیا گیا جو وحدت کے بنیادی اصول کے خلاف تھا۔ پس تفسیر نویسی کے فن کی بنیادیں ہی ایک ایسے باطل پر رکھی گئیں کہ قرآن کی ترتیب نزولی سے مطابقت یا عدم مطابقت اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی کیونکہ اس فن کے ایجاد کا مقصد ہی دین الٰہی کی غرض و غایت کو عوام کی نظروں سے اوجھل کر دینا تھا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ معدودے چند دانشورانِ ملت کے سوا، جن کے نامِ نامی مقالے کی سابقہ سطور میں حوالہ زد کر دیے گئے ہیں، تقلید پرست مسلمانانِ عالم آج تک اس بڑے جرم اور اس کے مرتب ہونے والے تباہ کن نتائج سے بے خبر ہیں۔

اس علمی بحث اور اس کے نتائج تک پہنچ جانے کے بعد اب ہم اپنے مقالے کے اختتام کی جانب قدم بڑھاتے ہیں۔

پہلے یہاں ایک عدد اعتراض سے نبٹ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک فاضل دوست کی جانب سے کچھ اس پیرایے میں اعتراض کیا گیا کہ تم تو قرآن کے تمام قدیمی چلے آرہے معانی کو مسترد کرتے ہوئے ردی کی ٹوکری میں پھینکنا چاہتے ہو۔ لیکن یاد رکھو، ہو سکتا ہے کہ آنے والی نسلیں تمہارے متعارف کردہ معانی کے ساتھ بھی ایسا ہی کریں۔ یہ وہ اعتراض ہے جسے ہم اپنے معاشرے میں موجود کسی بھی جوہرِ قابل کو کوئی بھی نیا کام کرنے سے بالجبر روک دینے کا ایک عمومی رجحان کہ سکتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ رجحان صرف ہمارے جیسی مردہ قوموں میں ہی پایا جاتا ہے۔ ایسے اعتراضات کی فلاسفی یہ ہوتی ہے کہ "ہم تو ڈوبے ہیں صنم، تجھ کو بھی لے ڈوبیں گے" ۔ یعنی جو ہاتھ پیر مارنا چاہتا ہے تا کہ اُس گردابِ بلا سے باہر نکل آئے جس کی زد میں پوری امت آچکی ہے اور نیچے ہی نیچے اتھاہ گہرائیوں ڈوبتی جارہی ہے، اس سے کہا جارہا ہے کہ نہیں، ایسی کوشش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تُو بھی ہمارے ساتھ ہی ڈوب مر۔ تیری یہ جرات کیسے ہوئی کہ بچنے اور بچانے کی تدابیر سوچے یا کرے؟

عرض یہ ہے کہ قرآن پر کیے گئے تمام سابقہ تفسیری کام کو تو ہمارے جدید دور کے دانشورانِ ملت پہلے ہی لاحاصل قرار دے کر مسترد کر چکے ہیں، سُو یہ عاجز کون سا نیا اور قابلِ اعتراض کام کر رہا ہے کہ اس پر اعتراضات کا پٹارہ کھول دیا جائے؟ اور یہ استرداد اس بنا پر کیا گیا ہے کہ اس کام کے ذریعے قرآنی تعلیمات کی حقیقی شکل قطعی سامنے نہیں آسکی کیونکہ اس سے امت میں اب تک قوتِ عمل کا وہ لاوہ نہیں پھوٹ سکا جو امت کے مظلوم "سافلہا" کو "عالیہا" کی جگہ دے سکے۔ یہی وہ انقلاب ہوتا ہے جو الہامی تعلیمات کا لازمی ردعمل ہوا کرتا ہے اور جسے قرآن کے مختلف اسالیب میں سورہ حجر کے ان الفاظ کے طرز پر بیان کیا گیا ہے: فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن سِجِّيلٍ ﴿٧٤﴾ یعنی بالادست طبقات کو ذلیل و پست کر دیا جاتا ہے اور زیردستوں کے ہاتھ میں قیادت آجاتی ہے۔ تو کیا آپ واقعی یہ چاہتے ہیں کہ یہی "سٹیٹس کو" Status quo برقرار رہے، کوئی کوشش نہ کی جائے، اور پوری امت خائن اور غاصب حکمرانوں اور دنیا کی بڑی طاقتوں کی یونہی غلام بنی اپنی محرومیوں اور اپنے دکھوں پر آنسو بہاتی گذر جاتی رہے؟

گذارش ہے کہ ہمیں تو اپنے نہایت موقر دانشورانِ ملت کے افکار کی روشنی میں اپنے اس منجمد کر دیے گئے شاستر کو ایک نئی زندگی عطا کرنی ہی ہے اور اس مقصد کے لیے نئے معانی متعارف کرانا ایک لازمی امر اور ہمارا فرضِ منصبی ہے۔ اگر خدانخواستہ آپ بذاتِ خود اس مہم میں شریک ہونے کا حوصلہ

نہیں رکھتے، کیونکہ آپ کو آپ کے اہل و عیال کی روٹی اور مکھن [bread and butter] وافر میسر ہے اور جدید سائنس کا مداح ہونے کی حیثیت سے اس خالص مادی تسکین سے بڑھ کر کسی اعلیٰ مقصد کی جانب آپ کی توجہ اور سوچ جا ہی نہیں سکتی، تو آپ بخوشی اس منجمد شاستر کو پڑھ پڑھ کر اس کی کجیاں، کمزوریاں اور عیوب ہر فورم پر اچھالتے رہیں۔ اور ان کا تقابل سائنسی حقائق سے کر کے مذاق اُڑاتے رہیں۔ اور اصلاحِ احوال کی کوئی صورت پیدا کرنے سے مجرمانہ غفلت برتتے رہیں۔ یہ آپ کا ہی نہیں بلکہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کا موجودہ عمومی اور اجتماعی طرزِ عمل ہے۔ لیکن کی عاجز نے اگر اس بڑی مہم کا بیڑہ اُٹھایا ہے اور دانشورانِ ملت کے افکار کو ایک مطلوبہ تعمیری و انقلابی شکل عطا کرنے کے لیے محنتِ شاقہ کر رہا ہے تو کم از کم اُس کی راہ میں روڑے تو نہ اٹکائیں۔ عاجز کی اس مہم کے ساتھ آئندہ نسلیں کیا کریں گی یہ بات آپ ابھی نہیں جان سکتے، نہ ہی آپ کی ممدوح و محبوب سائنس اس امر کو دریافت کر سکتی ہے۔ اس لیے قیاسات اور پیشن گوئیوں سے کام لینا بے کار ہو گا۔ انسانی ارتقاء جاری ہے اور اس کے باوصف ہمیں امید ہے کہ ہمارا کیا ہوا کام اگلی نسلوں کو آگے بڑھنے کے لیے ایک مزید ترقی یافتہ پلیٹ فارم ضرور عطا کرے گا۔

اس ضمن میں یہ بھی آپ کی اطلاع کے لیے عرض کر دیا جائے کہ یہ نئے معانی نہ تو زبان دانی کے اصولوں کے خلاف ہیں، نہ ہی خارج از عربی زبان ہیں اور نہ ہی متعلقہ مادوں اور ان کے ذیلی مشتقات اور ترکیبات کو نظر انداز کرتے ہوئے لائے جا رہے ہیں۔ قرآن کے معاملے میں ایسا ممکن ہی نہیں ہے کہ جو بھی کوئی فردِ واحد جیسا چاہے ویسا ترجمہ کر لے، جیسا کہ آپ نے باور کیا، اور اُس کے لیے شرفِ قبولیت بھی حاصل کر سکے۔ ایسی سوچ رکھنے والے احمقوں کی جنت میں تشریف فرما ہیں۔ قرآن حکیم کا ایک ایسا بامعنی ترجمہ کرنا جو قرآنی الفاظ کی روح اور لسانی حدود سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہ ہوتا ہو، اور قرآن کا مافی الضمیر بھی واضح اور روشن انداز میں کھول کر بیان کر دے، نہ ہی بچوں کا کوئی کھیل ہے اور نہ بے فکروں کی زبانی درازی کا کوئی کھُلا میدان کہ ہر ہما شما معتبر بن کر جیسا چاہے کرتا پھرے۔ اس میدان میں اپنی مرضی اور خواہش کا اطلاق کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ایسا کرتے ہی تمام معانی معیار سے گر جاتے ہیں اور مبہم و لایعنی ہو کر فہم سے بالا بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ تمام موجودہ تفاسیر و تراجم خود دیکھ لیجئے۔ یہ وہی ہیں جن میں خواہش پرستانہ کام کیا گیا ہے اور اس لیے آپ جیسے تعلیم یافتہ لوگ ان میں ہزاروں کیڑے نکال سکتے ہیں، اور نکالتے رہتے ہیں۔ تمام قابل ترین جدید دانشوران ان کے بڑے حصے کو مسترد کر چکے ہیں۔ دُور کیوں جایئے، ہمارے ہی دور میں ایک اچھی ترقی پسند ابتدا رکھنے والے مکتبِ فکر، لاہور کے آستانہ، کے ہاں یہی صورت حال اُس وقت دیکھنے میں آئی جب قرآن کی ترجمانی کا رُخ ایک بڑے تبدل و تحول کی نذر کر دیا گیا اور اسے اپنی خواہش کے تابع کرتے ہوئے ایک مخصوص مادی اور دہریاتی نظریے کے طور پر پیش کیا جانے لگا۔ اور پھر اس کی وجہ سے یہ ہوا کہ حلقۂ درس کی تمام مجموعی فکر اور کاوش استعمال کرنے کے باوجود نئے تراجم کی حالت بقولِ شاعر وہ ہو گئی کہ۔۔۔۔ "کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی"۔ اور الحاد و دہریت کا ٹھپہ بھی لگ گیا۔ پس اس ضمن میں آپ کو فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ "العصر" یعنی زمانے اور وقت کی قسم یونہی نہیں اُٹھاتا۔ وقت اور زمانہ اپنا ایک حتمی اور قطعی فیصلہ کُن ردِ عمل قوموں اور قبیلوں پر خود صادر کر دیا کرتا ہے۔ جو بھی تراجم خالق و مالک کا مقصود و منشاء پورا کرنے کے ناقابل ہوں گے وہ بلا استثناء از خود تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دیے جائیں گے۔

تفسیر نویسی ایک جرم و گناہ ہے کیونکہ یہ تفہیمِ قرآن کا اللہ و رسول کی جانب سے مجوزہ یا منظور شدہ نسخۂ کیمیا نہیں ہے،،، بلکہ یہ طریقۂ تفہیم تو کثرت سے انسانی خیالات و تصورات کی آمیزش کے باعث اللہ کی مقررہ کردہ حدود سے انحراف اور تجاوز کے مترادف ہے۔ جیسا کہ اس کتاب کے جزء اول [تحقیقِ تفسیر نویسی] میں بہت سی قرآنی نصوصِ صریحہ کی اسناد و تصدیق کے ساتھ واضح کیا گیا، قرآن کو ہی بزبانِ خود سب سے بہتر تفسیر [احسن تفسیر] قرار دیا جا چکا ہے اور متعدد بار یہ بھی فیصلہ دیا جا چکا ہے کہ کوئی فرد اکیلے یا کوئی جماعت مل کر بھی اس سے بہتر انداز میں بیان کی ہوئی تحریر پیش نہیں کر سکتے۔ فلہٰذا، قرآن فہمی کے لیے عوام الناس صرف اس الہامی وثیقے کے اپنی زبان میں ایک ایسے منضبط ترجمے کے حقدار ہیں جو قرآنی نصوص اور الفاظ و اصطلاحات کے لغوی معانی سے ایک انچ بھی ادھر اُدھر نہ ہٹتا ہو۔ اور نہ ہی اس کا علمی و ادبی درجہ پست کرنے کے لیے اس کے نہایت عامیانہ اور بازاری معانی منتخب کرتا ہو۔ صرف اسی ایک طریقے سے قرآنی مقاصد، اہداف اور نصب العین پوری دنیا کے سامنے لائے جا سکتے ہیں۔ جیسا کہ کتاب کے جزء دوم [قرآن فہمی اور عربی زبان] میں بیان کیا گیا، صرف عربی زبان کے گرامر کی گردانیں یا عربی شاعری کی باریکیاں سمجھنے میں دس سال صرف کر دینے سے ان مقاصد، اہداف اور نصب العینوں کا شعور اور انہیں عوام الناس کے سامنے لانے میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔ گہرا ہمہ جہتی تاریخی اور عمرانی مطالعہ اور وسیع الاطراف علمی تناظر جو انسانی شعور کو ارتقاء کی ایک خاص منزل تک پہنچا سکے، اس مہم کے پیشگی تقاضے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس ضمن میں جو بھی تیار کردہ تراجم ان مقاصد کو بروئے کار لانے میں اب تک ناکام رہے ہیں، یا آئندہ بھی ناکام رہیں، انہیں غیر معیاری قرار دے کر اشاعت کا اہل ہی نہیں سمجھا جانا چاہیئے۔ اور ایسی کوششیں کرنے والوں کو سخت انتباہ کر کے ایسی اہم مہمات سے باز رہنے کا حکم دیا جانا چاہیئے۔ نیز ایسے تمام مترجمین کو نااہل قرار دے دینا چاہیئے جن کے تراجم غیر موزوں مرادفات کا استعمال کرتے ہوئے وہی فرسودہ تصورات، معجزات و توہمات، پرستش کی مردہ رسومات، بے روح دعائیں و مناجات، تقدیر پرستی، قناعت و صبر کی اُسی طرح تلقین کرتے ہوں جیسے کہ تمام تر موجود تفاسیر کے ذریعے امت کی سوچ میں داخل کیا جا چکا ہے۔ یا جن کے تراجم ایسے مبہم انداز یا ایسی غیر واضح زبان کے حامل ہوں جو اہلِ علم و شعور کے فہم میں آنے کے قابل ہی نہ ہو۔

تفسیر نویسی کی آڑ میں جس جرم کا ارتکاب کیا گیا اس کی نوعیت کچھ اس طرح ہے کہ عربی زبان کے الفاظ کے معانی کی وسعت اور پھیلاو کی حدود میں سے نہایت کرشمہ سازی کے ساتھ وہی مخصوص معانی منتخب کر لیے گئے تھے جو انتہائی عامیانہ، بازاری اور گھٹیا تھے اور جن کے ذریعے قرآن کے پیغام کو تبدیل کرتے ہوئے اس کے اصل مقصود و مطلوب کو چھپایا جا سکتا تھا۔ جب کہ معانی کے وسیع پھیلاو میں سے وہ کلمات نظر انداز کر دیے گئے جو علمی، ادبی اور گہرے استعاراتی یا محاوراتی معانی فراہم کرتے تھے لیکن قرآن کے مافی الضمیر کو پوری حقانیت کے ساتھ واضح کر دیتے تھے۔ اور اس الہامی وثیقے کے ادبِ عالی کا ایک شاہکار، اور عوامی انقلابِ عظیم کا ایک اعلان، ہونے کی حیثیت بھی برقرار رکھتے تھے۔ قبل ازیں اس مخصوص ارتکابِ جرم کی دو مثالیں سورۃ البقرۃ اور سورۃ النساء کے عنوانات کے لغوی معانی کے حوالے سے وضاحت پیش کرتے ہوئے سپردِ قلم کر دی گئی ہیں جہاں سے اس جرم کی نوعیت کی پوری حدود قاری کے سامنے آ جاتی ہیں [قسط نمبر ۱۰]۔

مقصدِ تحریر ہمارے انتہائی فاضل دانشورانِ قرآن کے افکار و نظریات کی اہمیت کو کم کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ان کی قدر و قیمت کا پورا ادراک کرتے ہوئے اِس مخصوص ریسرچ کو اُس بلند مقام سے تھوڑا اور آگے لے جانا ہے جہاں ہمارے ان روشن خیال مفکرین نے اسے اپنی زندگیوں میں پہنچا دیا تھا اور ہمارے علمی مستقبل کے راستوں کو منور کرنے کے لیے اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ غاصب ملوکیت کے نام پر انسانیت پر جو قیامت ٹوٹی وہ اس کے نتائج و عواقب خوب جان چکے تھے۔ تفسیر نویسی کی فرومائیت ولایعنیت سے بھی وہ خوب آگاہ تھے۔ اسلامی دنیا میں پھیلے جبر واستبداد کے دور کی پوری طوالت سے وہ رُوشناس تھے اور اشتراکی انقلاب یا انقلابِ فرانس کی طرز کا کوئی انقلاب اسلامی دنیا میں بھی دیکھنے کے لیے ان کے دردمند دل آہ و پکار کرتے تھے۔ اگر عہدِ حاضر کی تحقیق و تفتیش ہمارے ان لائق دانشوروں کو دستیاب ہو جاتی اور وہ ملوکیت کی قرآن کو مسخ کرنے کی ہمہ گیر سازش کو بھی بے نقاب کر سکتے جو آج اِس مکتبِ فکر کے ذریعے کر دی گئی ہے، تو یقین کامل ہے کہ ہمارے وہ لائق فائق اساتذہ بھی تفسیر نویسی کی اصل و اساس کو نہ صرف سمجھ چکے ہوتے بلکہ اس اندازِ تحریر کو قرآن کے خلاف مانتے ہوئے ترتیبِ نزولی کے مطابقت میں، یا طبقاتی پیراڈائم کا لحاظ رکھتے ہوئے، تفسیر نویسی کا ایک اور نیا باب کھول دینے کی سفارش ہرگز نہ کرتے۔ بلکہ اس فنِ کتابت کو کالعدم قرار دے چکے ہوتے۔

درحقیقت ہماری تفاسیر میں قرآن کے انقلابی اہداف و مقاصد ترتیب نزولی کو ملحوظِ خاطر نہ رکھنے کے باعث، یا طبقاتی پیراڈائم میں کام نہ کرنے کے باعث، سکالرز کی نظر سے اوجھل نہیں ہو گئے تھے، بلکہ اِس وجہ سے جان بوجھ کر اوجھل کر دیے گئے تھے کہ تفسیر نویسی کے مذموم فن کی اصل و اساس ہی بنو امیہ کے دربار کی سازش پر قائم تھی۔ اور اس سازش کا بعینہٖ یہی مقصد تھا کہ قرآن کے پیغام کے تمام حقیقی خدوخال نظروں سے اوجھل کر دیے جائیں۔ پس بڑی کامیابی سے کر دیے گئے۔ ترتیبِ نزولی یا ترتیبِ رسولی کے دونوں آپشنز میں سے کوئی بھی اختیار کر لینے سے بنو امیہ کے بھیانک عزائم کی تکمیل کے عمل میں کوئی جوہری فرق نہیں پڑ سکتا تھا،،،،، اور طبقاتی پیراڈائم کا ذرہ برابر بھی اقرار یا اظہار ان کی مستبدانہ پالیسیوں کے صریحا خلاف تھا۔

قرآن خود اپنی بہترین تفسیر ہے۔ رسولِ خدا کی مستند سیرت کا بیان سامنے رکھتے ہوئے [روایات پر مبنی آپ کی ذاتیات کے بارے میں خرافات کو نظر انداز کرتے ہوئے]،،،،، اسلامی تحریک کے ترتیب وار واقعاتی تسلسل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے،،،،، طبقاتی تناظر کی روشنی میں مکہ کے سرداران اور بالعموم یمن سے سیریا تک پھیلی سرزمینِ عرب کے تمام ظالم اور بالادست طبقات اور معاشروں کے غلام ساز اداروں کے خلاف مظلوم اور زیرِ دست عوام کی کشمکش کا پورا اسکوپ مطالعہ کرتے ہوئے،،،،،، الہامی صحیفے کا ادبِ عالی کا پس منظر اور معیار برقرار رکھتے ہوئے،،،،، تمام اہلِ عرب و عجم سے مستعار لی ہوئی تفاسیر اور انہی سے متاثر تراجم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے،،،،، نہایت حدود آگاہ، منضبط اور انسانی قابلیت کی معراج کا استعمال کرتے ہوئے،،، ایک روشن اور واضح ترجمہ ہی وہ واحد حل ہے جو قرآن کے مقصود و مطلوب اور نصب العینوں کو سامنے لا کر امت کے طول و عرض میں ایسی قومی تحریکیں پیدا کر سکتا ہے جو عظیم تبدیلیوں کا استعارہ بن جائیں۔ اور عوامی انقلابات کے ذریعے اقتدار پر قابض تمام طاغوتی خاندانوں اور ان

کے کاسہ لیسوں کو ان کے بلند و بالا مناصب سے اُکھاڑ کر تاریخ کے ان سیلن زدہ تہ خانوں میں پھینک دیا جائے جہاں ایسی بدبودار غلاظتوں کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ عاجز انفرادی طور پر ماقبل سے ہی روبہ عمل ہے۔ قرآن کے موضوعاتی عقلی تراجم کی ایک سیریز کا آغاز کر چکا ہے۔ اب تک ۱۳۵ اہم قرآنی موضوعات [Themes] پر جدید اور ترقی یافتہ علوم کی روشنی میں، اور جدید عقلیاتی معیار کے مطابق پیرایہ اظہار استعمال کرتے ہوئے، آسان فہم تراجم پیش کر چکا ہے جو Scribd کے ساتھ ساتھ مقامی ای-لائبریریوں میں اپ لوڈ کیے جا چکے ہیں۔ ان موضوعاتی تراجم سے عمومی فیض رسانی کا عمل جاری و ساری ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ انفرادی کوشش موسلا دھار بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہو اور قرآنی دوست احباب مل کر اسے اجتماعی شکل دیں اور قرآنی قافلے کو کامیابی کی بڑی منزلیں طے کرانے میں مددگار اور راہنما بن جائیں۔ مختلف قرآنی موضوعات پر واضح اور دوٹوک انداز میں لکھے جانے والے مختصر آرٹیکلز کا سلسلہ بھی جاری ہے جو ایک حتمی انداز میں ہمارے حج، نماز، روزہ، زکاۃ، طلاق، سود وغیرہ جیسے امور کا پسِ منظر اور ان کی معاشرتی حقیقت، اور دیگر الہامی نظریات کی تفہیم عامۃ الناس کے لیے آسان کرتے ہیں اور جن کی ہر گھر اور ہر ادارے میں ضرورت ہے۔ نیز وطنِ عزیز میں موجود مختلف قرآن دشمن عناصر کی جانب سے وقتاً فوقتاً قرآنی قبیلے کی تذلیل، تضحیک اور اُن کے خلاف فتوے بازی کا موثر جواب دے کر ایسے عناصر کو زبان بندی پر مجبور کر دینا بھی آج قرآنی میدان میں صرف اسی عاجز کے ذمہ لگا دیا جانے والا ایک اور بڑا کام ہے۔ اس سلسلے کی بھی بہت سی تحریریں ہماری ای-لائبریریوں میں آپ موجود پائیں گے۔ یہ عاجز ایک قرآنی انقلابی سیاسی تحریک کی تین سال تک اس کے قیام سے لے کر ۱۰۵ شہروں اور قصبوں تک توسیع کے عمل کی سربراہی بھی کر چکا ہے۔ شومئی قسمت کہ یہ تحریک بعد ازاں چند مذموم عناصر کی تنگ نظری اور ناعاقبت اندیشی کی نذر ہو گئی۔

فی الحقیقت قرآنی مقاصد سے آگہی کی اِس بڑی مہم کے عالمی پیمانے پر موثر ہونے کے لیے اسلامی حکومتوں کو ایک علمی اور تحقیقی اتحاد کی فوری ضرورت ہے۔ ایک سمجھوتے کے تحت عالمی درجہ رکھنے والے مسلم دانشوروں کی ایک ایسی ٹیم مختلف اسلامی ممالک سے اکٹھی کی جائے جن کے تعلیمی کوائف اعلیٰ ترین علمی قابلیت کے معیار پر پورے اُترتے ہوں۔ ان سکالرز پر مشتمل ایک عالمی تحقیقی ادارہ قائم کر دیا جائے جو دنیا کی تمام اہم اور وسیع علاقوں میں مستعمل زبانوں میں قرآن کے شایانِ شان، کسی تفسیر کی بجائے، ایک متفقہ معیاری اور انتہائی معروضی ترجمہ منصہِ شہود پر لانے کا اہتمام کرے۔ اس ادارے کو ایک مشترکہ فنڈ کے ذریعے وہ تمام مالی استطاعت مہیا کی جائے جو ان کی تحقیق میں ہر طرح کے ترقی یافتہ ذرائع کو اختیار کرنے میں کسی رکاوٹ کو مانع نہ ہونے دے۔ اس ادارے کے زیرِ اہتمام ایک متفقہ علیہ اور نہایت اہل ترجمہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا جائے جو جدید ترین عقلیت کے مطابق قرآن کی تمام مختلف الجہات خوبیاں اور اس کے الہامی علم کی باریکیاں جدید علمی اور سائنسی پیرایے میں، فطرت، معاشرے اور انسانی ذات کے تناظر میں، عوام الناس کے سامنے آشکار کر دے۔ یہی ادارہ اس بات کا بھی اختیار رکھتا ہو کہ اس کام پر ٹھوس اور مستند نکتہ چینی وصول کرے اور اس کی روشنی میں اپنے کام میں حک و اضافہ یا ترمیم و تبدیلی کر سکے۔ اس ادارے کا شائع کردہ ترجمہ تمام مسلم ممالک اور غیر مسلم اقوام کے لیے مستند مانے

جانے کا حقدار ہو۔ نیز وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ نئے نئے علمی انکشافات کی روشنی میں اگر اس کام کی کچھ جزئیات کو وقتاً فوقتاً اپ ڈیٹ[update] بھی کرنا پڑے تو یہی ادارہ اس کام کا اختیار بھی رکھتا ہو۔ اگر ایسا اتحاد فی الفور ممکن نہ ہو، جیسا کہ قرائن سے ظاہر ہوتا ہے، تو کم از کم پاکستان میں ہی ایک ایسی حکومت کے قیام کی کوشش کی جائے جو اس مہم پر کام کرنے پر آمادہ ہو اور ایک ایسا ادارہ قائم کرنے کے لیے پورا اختیار اور مالی وسائل مہیا کر دے تا کہ کسی نہ کسی پیمانے پر یہ بنیادی کام شروع کر دیا جائے کہ جس پر امت مسلمہ کی بیدارِیِ نو یا نشاط ثانیہ منحصر ہے۔

محترم قارئین، اس تیسرے جزء کو پیش کرتے ہوئے تفسیر نویسی کے فنِ کتابت کی لایعنیت[Absurdity]کے بارے میں یہ مقالہ درجِ بالا الفاظ کے ساتھ ہی مکمل کر دیا گیا ہے۔ نیز مستقبل قریب کے لیے ایک قابلِ اطلاق لائحہ عمل بھی پیش کرنے کی مخلصانہ کوشش کی گئی ہے، کیونکہ ایک لکھنے والا اگر صرف مسائل کا رونا روتا رہے اور ان کا حل پیش کرنے کے قابل نہ ہو،،،،، جیسا کہ عمومی رجحان فی الوقت نہایت زور و شور سے ہر فورم پر جاری ہے کہ جو جتنی زیادہ چیخ و پکار کرے اور حاضر برائیوں کا ڈھنڈورا پیٹے وہ اُتنا ہی زیادہ مقبول ہے،،،،، تو ایسی تحریر صرف نوحہ اور المیہ ہی مانی جا سکتی ہے۔ اس میں دانش و ارتقاء کا لازمی تعمیری عنصر مفقود پایا جائیگا اور یہ لاحاصلیت[Futility] پر مبنی ہو گی۔ معنی خیز پنجابی زبان میں ایسے لاحاصل عمل کو ""پھُوڑی ڈالنا"" کہا جاتا ہے۔ نیز حل پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس ضمن میں سب سے قبل اپنی ذات سے کوششوں کا آغاز بھی کر دیا گیا ہے، جیسا کہ اوپر کی سطروں میں خاصی تفصیل سے نشان دہی کر دی گئی ہے، تا کہ "اوروں کو نصیحت اور خود میاں فضیحت" والا محاورہ سامنے نہ رکھ دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات عالی سے امید ہے کہ یہ کاوش تمام ساتھیوں اور قارئینِ کرام کے لیے شرحِ صدر کا باعث ہو گی۔

تفسیر نویسی کے مضمون پر یہ تینوں سلسلے جلد ہی ایک مربوط کتاب کی شکل میں بھی پیش کر دیے جائیں گے۔ فی الحال چند روز تک آپ یہ تینوں سلسلے علیحدہ علیحدہ ہماری الیکٹرونک لائبریریوں میں موجود پائیں گے۔ البتہ اس سلسلے کا پہلا جزء "تحقیقِ تفسیر نویسی" کے عنوان سے ماقبل سے ہی ہماری ای-لائبریریوں میں موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی بے پایاں رحمتیں نازل فرمائے۔